© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرم مراد

وطنِ عزیز ایک عرصہ سے جس سنگین بحران سے گزر رہا ہے' وہ اب انتخابات کے مرحلہ میں داخل ہو کر بظاہر پر سکون ہوگیا ہے۔ لیکن' جیسا ہم گذشتہ شمارہ (اگست' ۹۳) میں لکھ چکے ہیں' ہم جب بھی

> کسی بحران سے نکلے' تو اس طرح کہ اسباب کا کچھ ازالہ نہ ہوا۔ ہاں' مارشل لا اور ناقص یا مصنوعی انتخابات جیسی تدابیر سے حالات کو پر سکون کر دیا گیا۔ . . . جب تک یہ سطور آپ تک پہنچیں گی غالبًا ایک دفعہ پھر کوئی نہ کوئی مصنوعی تدابیر اختیار کی جا چکی ہوں گی' کیونکہ حقیقی حل کے لیے قدم اٹھانے کو اب بھی کوئی تیار نہیں۔

چنانچہ بالکل یہی ہوا ہے۔ صحیح معنوں میں کوئی حقیقی حل تو کردار کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں' لیکن سب سے بہتر راستہ' اب بھی ہماری نظر میں' وہی تھا جو ہم نے تجویز کیا تھا۔ یعنی' ملک کے تینوں مقتدر (فوج + صدر + وزیراعظم)' دیگر سیاسی قوتوں کے اتفاق کے ساتھ' انتخابات کے عمل کو منصفانہ بنانے اور آمریت اور بدعنوانیوں کا راستہ بند کرنے کے لیے مستقل انتظامات کو بروئے کار لاتے' اور منتخب حکومت کو اپنی مدت پوری کرنے کی مہلت دیتے' یا اس سے پیشتر ہی انتخابات کے لیے کسی مناسب تاریخ پر اتفاق کرلیتے۔ اس طرح قوم فوری مصنوعی انتخابات کے بخار اور اس کے بعد رونما ہونے والے متوقع ناخوشگوار نتائج سے بچ سکتی تھی۔

ملک کی اصل قوتِ قاہرہ چاہتی تو ایسا ہونا بالکل ممکن تھا۔ بلکہ' اگر وہ مرکزی حکومت کے ایجنٹ کے طور پر اپنا فرضِ منصبی ہی ادا کرتی' تو منتخب حکومت' کسی متفقہ فارمولے کے بغیر بھی' اپنی مدت پوری کر سکتی تھی۔ اس نے ان دونوں میں سے کوئی راہ بھی اختیار کرنا کیوں پسند نہ کیا؟ یہ بڑا اہم اور دلچسپ سوال ہے۔ لیکن شاید اب' پاکستان کی قومی زندگی کے دیگر اہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوالات کی طرح یہ بھی ایک لاینحل معمہ کی طرح تاریخ کا حصہ بن جائے گا۔ ہم اس بارہ میں قیاس آرائی کر سکتے تھے، لیکن یہ وقت اس کے لیے مناسب نہیں۔

جب صحیح راستہ اختیار نہ کیا گیا تو سب سے کم نقصان دہ راستہ فوری انتخابات ہی کا رہ گیا تھا۔ اگرچہ جیسا ہم نے لکھا تھا "ہر حل میں خرابی کی صورت مضمر ہے" اور "انتخابات سے مسئلہ حل تو نہ ہوگا۔" لیکن کوئی اور چارہ کار اس لیے نہیں تھا کہ "نہ کرانے کی صورت میں حالات بدتر ہو سکتے ہیں"۔ تعجب یہ ضرور ہے کہ فارمولے پر اتفاق کراتے ہوئے ان ممکنہ اصلاحات کے بارہ میں بھی نہیں سوچا گیا جن سے انتخابات کے نتائج بہتر حاصل کیے جا سکتے تھے۔ یہ شاید اس لیے کہ قوم کو فوری انتخابات میں مبتلا کرنے والے اس سے بہتر کوئی نتیجہ حاصل کرنا نہیں چاہتے کہ وہی لوگ اوپر آئیں جو اب تک کبھی نہ کبھی برسراقتدار رہے ہیں، یا شاید ترجیح اس کو ہو کہ موجودہ ٹولہ بدل جائے۔ لیکن جو بھی آئے اس کو جمہوری جواز حاصل ہو، اور وہ ان کی مرضی کا کام کرے۔ اور ان کاموں میں سرفہرست یقیناً امریکہ سے قدیم فدویانہ تعلقات کی استواری ہے۔ اور اس کی قیمت کے طور پر سیاسی نظام میں تبدیلی، دستور کا خاتمہ، ہوم فرنٹ پر بنیاد پرستی کا ازالہ، خارجہ پالیسی میں اسرائیل اور بھارت سے مفاہمت اور وسط ایشیا سے اجتناب---جو کچھ جتنا بھی حاصل کیا جا سکے۔

آج ہم عرصہ محشر میں ہیں۔ جب عالمی سطح پر دم بدم انقلاب انگیز تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، عالم پیر الٹ پلٹ ہو رہا ہے، جن کو کارِ جہاں سے غرض ہے وہ تو دور کی سوچ رہے ہیں اور اپنے سارے پیمانے اور اندازے بدل چکے ہیں۔ لیکن یہ اپنی بدقسمتی محسوس ہوتی ہے کہ وہ جو ایک جہانِ نو کے داعی اور علمبردار ہیں، سب انقلابات سے غافل، نصف صدی قبل کے پیمانے لے کر آنے والے انتخابات میں برسرِپیکار مختلف قوتوں کو ناپنے تولنے اور اپنی پسندیدہ حکمتِ عملی متعین کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ پیمانے جو اب فرسودہ اور حقیقت سے دور ہو چکے ہیں۔ وہ اب بھی دائیں اور بائیں بازو کی تفریق کو حقیقت سمجھ کر برقرار رکھنے پر مصر ہیں، حالانکہ یہ تفریق اب اپنے معنی کھو چکی ہے۔ وہ پھر سے یہی سوچ رہے ہیں کہ چھوٹی برائی کے پلڑے میں انقلابِ اسلامی کی علمبردار قوتوں کو پہلے کی طرح اپنا وزن ڈال دینا چاہیے تاکہ نیکی کے غلبہ کی راہ ہموار ہو سکے، حالانکہ اب چھوٹی اور بڑی برائی کے درمیان فرق بڑی طاقتور خوردبین کی مدد سے ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ وہ پس منظر ہے جس نے آنے والے انتخابات میں تحریکِ اسلامی کو ایک مشکل اور نازک صورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے۔ اس صورتِ حال سے ایسی حکمت اور نظر سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت ہے کہ نقصان کم سے کم ہو' اور نفع زیادہ سے زیادہ۔ اس غرض کے لیے اہلِ قافلہ کو کم از کم حقائق کا صحیح ادراک ضرور ہونا چاہیے۔

ایک طرف تحریک کا وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے وہ نصف صدی سے کوشاں ہے۔ یعنی زمامِ کار میں تبدیلی آئے' بھلائی اور نیکی کی حامل قوتیں اوپر آئیں' اور دین کو غلبہ حاصل ہو۔ اس کے ساتھ تاریخی اور تہذیبی تغیرات کا چیلنج ہے' جو تقاضا کر رہا ہے کہ "جو ہے وہ نہ رہے" اور عصرِ حاضر نے جس شرعِ پیغمبرؐ کی نمود کو قریب تر کر دیا ہے' وہ شرعِ پیغمبرؐ آشکار کی جائے۔ پاکستان کے خلاف عالمی طاقتوں کی یلغار ہے' ان کے منصوبے اور ریشہ دوانیاں ہیں' اس خطہ کے لیے ان کے سوچے سمجھے نقشے ہیں' بھارت اور اسرائیل کا گٹھ جوڑ ہے' (انہی کا ایک حصہ یہ انتخابات بھی ہیں)' جن کا مقابلہ پوری ہمت' حوصلہ' جوانمردی اور فراست و تدبر سے کرنا ضروری ہے۔ ملک کے اندر ضعف' اخلاقی انحطاط' ظلم و فساد' معاشی ناہمواریاں' مجموعی افتراق و انتشار اور مقتدر قوتوں کی باہمی آویزش ہیں' جن کے ازالہ کے لیے اخلاص کے ساتھ صحیح خطوط پر کوشش ناگزیر ہے۔ یہ سارے چیلنج اور مسائل اس بات کے متقاضی ہیں کہ عامتہ المسلمین میں جتنا خیر جہاں بھی پایا جاتا ہو' تحریک اس کو یکجا اور منظم کرے' اس کو ایک متبادل قوت بنائے' کسی چھوٹی بڑی برائی کے بجائے خیر کی مجموعی قوت کو غالب کرنے کے لیے ایک مناسب حکمتِ عملی اختیار کرے' اور اس قوت کی کامیابی کے لیے اپنی ساری قوتیں کھپا دے۔ ایسی حکمتِ عملی کی طرف رہنمائی کے لیے ہی ہم نے جنوری کے شمارہ میں سیّد مودودیؒ کے افکار کا خلاصہ پیش کیا تھا' اور ان کی روشنی میں اس سلسلہ میں چند خطوط کی نشان دہی بھی کی تھی۔

تحریک نے ابھی ایسی حکمتِ عملی کی سمت میں ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ ملک کو انتخابات میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مستقل حکمتِ عملی پیش رفت کے لیے وقت چاہتی ہے' اور انتخابات سر پر کھڑے ہیں۔ لیکن فوری انتخابات کے دباؤ کے تحت کوئی ایسی پالیسی اختیار کرنا جو اس مستقل حکمتِ عملی کی بساط لپیٹ دے' یا اس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دے' اپنے اصل مقصد کے حصول' وقت کے چیلنج اور ملک و ملت کے مفاد سے روگردانی کے مترادف ہوگا۔

دوسری طرف' ان انتخابات کے نتائج ملک کے لیے' اور تحریک کے لیے بھی' اہم ثابت ہوسکتے ہیں۔ اور تحریک جو انتخابی پالیسی اختیار کرے گی' اس کے جو اثرات ان نتائج پر پڑ سکتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں وہ بھی اہم ہو سکتے ہیں۔ اس لیے آنے والے انتخابات کے نتائج سے بالکل صرفِ نظر کر کے صرف مستقل حکمتِ عملی ہی پر کاربند رہنا بھی دانش مندی پر مبنی نہ ہوگا۔

اگرچہ صرف ان انتخابات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی پالیسی بناتے ہوئے' اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے پہلے کے' خصوصاً ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ کے' انتخابات نے کوئی ایسے نتائج پیدا نہیں کیے جن سے ملک و ملت کی بہتری ہوتی' حتیٰ کہ جمہوریت کی گاڑی بھی پٹڑی سے نہ لگ سکی۔ تحریک نے بھی جن نتائج کی توقع میں اتحاد میں شرکت کی پالیسی اختیار کی' اس سے کوئی قابلِ ذکر نتائج مرتب نہ ہوئے۔ نہ نفاذِ شریعت کے لیے' نہ ملک و ملت کے لیے۔ نہ مطلوبہ مقاصد کی طرف کوئی پیش رفت ہوئی۔

اب تک کے حالات یہی بتاتے ہیں کہ آنے والے انتخابات میں بڑا معرکہ پیپلزپارٹی' اور اینٹی (مخالف) پیپلزپارٹی' پارٹی کے درمیان ہوگا۔ یعنی' محترمہ بے نظیر اور جناب نواز شریف کے درمیان۔ اگرچہ پس پشت قوتوں کی سوچ یہ لگتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی فیصلہ کن حیثیت حاصل نہ کرسکے' لیکن جب ایک دفعہ انتخابات کی بینڈ ویگن رواں ہوجاتی ہے اور معرکہ گرم ہو جاتا ہے' تو نتائج کا ان قوتوں کے کنٹرول میں رہنا یقینی نہیں رہتا اور یہ ان کی مرضی کے خلاف بھی نکل سکتے ہیں۔

جب ۱۹۷۰ سے آج تک کے سارے انتخابات پیپلزپارٹی کے محور پر ہی لڑے جاتے رہے ہیں' اور اب تک کی تحریک کی انتخابی پالیسی میں اسی عامل کو فیصلہ کن حیثیت حاصل رہی ہے' تو آج بھی لوگوں کا یہ اصرار قابلِ فہم ہے کہ تحریک اپنا وزن پیپلزپارٹی کے خلاف' یعنی جناب نواز شریف کے ساتھ' ڈالے۔ وہ برے سہی' لیکن بہرحال چھوٹی برائی ہیں' اور بڑی برائی کی راہ روکنے کے لیے اس چھوٹی برائی کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ یہ بات بھی بالکل بے وزن نہیں کہ' بصورت دیگر' پیپلزپارٹی کا پلڑا بھاری ہوسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارا نقطہ نظر یہی ہے کہ سیاست اور انتخابات کی حیثیت ایک جنگ کی سی ہے۔ جنگ میں تدبیر کی نوعیت اصول کی نہیں ہوتی' اِلّا یہ کہ اس سے کسی حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ حدودِ الٰہی کے اندر' جس تدبیر سے اپنی منزل کی طرف پیش رفت ہوسکتی ہو' وہ تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے سیاست میں تحریک کوئی دروازہ بند نہیں کرسکتی' کسی سے بھی معاملہ کرسکتی ہے' کسی سے بھی حلیفانہ تعلقات استوار کرسکتی ہے' کہ ایسا کرنا ناجائز نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جناب نواز شریف کے ماضی کے کردار سے عدم اطمینان کے باوجود ان کے ساتھ بھی معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جس سے بھی معاملہ کیا جائے اس کے مقام کا صحیح ادراک ضروری ہے۔ اور جو معاملہ کیا جائے اس کے بارہ میں صحیح اندازہ ضروری ہے کہ کیا پائیں گے اور کیا کھوئیں گے' اور جو پائیں گے وہ نقصان سے زیادہ ہوگا۔

پیپلزپارٹی کو شکست دینے کے لیے ان کا ساتھ دینا ہو' تو یہ جاننا ضروری ہے کہ کیاان کا ساتھ دے کر یہ ہدف حاصل ہوگا؟ اس بات سے تو اب ان کے حما-تیوں کو بھی اتفاق ہے کہ وہ ایک برائی ہیں۔ ان کا کہنا صرف یہ ہے کہ وہ ایک کم تر برائی ہیں۔ چھوٹی برائی کے طور پر ان کو قبول کرنا ہو' تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کے برسراقتدار آنے سے جو برائی آئے گی کیا بھلائی اس پر غالب ہوگی؟

اس سلسلہ میں چند باتیں سامنے رکھنا ضروری ہے'

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ کیا وہ اب تک پیپلزپارٹی کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں' جو اس مقصد کے لیے آئندہ کے لیے بھی ان پر اعتماد کیا جائے' اور ان کا ساتھ دیا جائے؟ ۱۹۹۰ کے انتخابات میں ان کی سربراہی میں اسلامی جمہوری اتحاد نے پیپلزپارٹی کو شکست دی' بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی' پارلیمنٹ میں ان کو دو تہائی حمایت حاصل ہوگئی' اور انہوں نے ایک بڑی مستحکم حکومت بنالی۔ یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ شمار ہوسکتا ہے' اگرچہ اس بات سے بھی انکار کرنا مشکل ہوگا کہ یہ کارنامہ سرزد نہ ہوتا اگر ان کو فوج اور صدر کی مکمل پشت پناہی حاصل نہ ہوتی' اور نگراں حکمراں' خصوصاً جام صادق' وہ ہتھکنڈے استعمال نہ کرتے جو انہوں نے کیے۔

لیکن ان کا اصل امتحان تو یہ تھا کہ وہ انتخابات کے بعد پیپلزپارٹی کو اسی مقام پر رکھتے جس مقام پر اسے انتخاب میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس امتحان میں ان کی مکمل ناکامی بالکل عیاں ہے۔ دو سال کے مختصر عرصہ میں انہوں نے پشت پناہ قوتوں کی حمایت کھو دی' حلیفوں کو ضائع کر دیا' پیپلزپارٹی کا سائز بڑھا دیا' اور قوم کو ایک دفعہ پھر ایسے انتخابات میں لاکر ڈال دیا جن میں اصل مدمقابل پھر پیپلزپارٹی ہی ہے۔ اب اس مقابلہ کی دہائی دے کر ان کے زخم خوردہ حلیفوں پر دباؤ ڈالنا کہ وہ ان کے دست و بازو بن جائیں کہاں تک معقول ہوسکتا ہے۔ کیا اس لیے کہ وہ پھر ایسے ہی "چوتے اور چھکے" ماریں' اور پھر اسی طرح آؤٹ ہوں؟

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیپلزپارٹی سے ان کی جنگ اقتدار کی جنگ ہے' اصولوں اور پالیسی و پروگرام کی نہیں۔ امریکہ کے اشارہ پر فوج اور حساس اداروں میں جو تبدیلیاں وہ لائی'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہوں نے بھی ان کو برقرار رکھا۔ تعلیمی پالیسی جو اس نے بنائی' سرورق تبدیل کر کے انہوں نے بھی وہی نافذ کردی۔ ساچی اینڈ ساچی کی بدنامِ زمانہ یہودی کمپنی کو اس نے اپنا ایجنٹ مقرر کیا ہے' انہوں نے بھی اسے ہی پسند کیا۔ میڈیا دونوں کے دور میں یکساں طور پر عریانی' اخلاق باختگی اور ہماری ایمانی و تہذیبی بنیادوں کی بیخ کنی کا کام ہی کرتا رہا۔ جو معاشی پالیسیاں انہوں نے بنائیں' پیپلزپارٹی کے نگراں وزیرخزانہ نے انہیں من و عن برقرار رکھا۔

یہ اداروں کے استحکام کی خاطر تو پیپلزپارٹی سے بحیثیت حزبِ اختلاف معاملہ کرنے پر تیار نہ ہوئے' جو ہماری نظر میں انہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہاں' صدر اسحٰق خاں کے اختیارات خود حاصل کرنے کے لیے آٹھویں ترمیم کے معاملہ پر اس کی حمایت کی ضرورت پڑی' تو انہیں اسے وزارتوں کی پیشکش کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ اگر وہ خود ہی صدر کا ساتھ دینے کا فیصلہ نہ کرتی' تو یہ بھی آصف زرداری کو وزیر بنا لیتے۔ اب اگر پیپلزپارٹی کو شکست دینے کے لیے ان کا ساتھ دیا جائے' تو کیا یہ سوچنا ضروری نہیں کہ کل' اپنے اقتدار کے لیے ضروری ہوا' تو کہیں وہ خود تو اسے گلے نہ لگالیں گے؟

۳- تیسری بات سوچنے کی یہ ہے کہ اگر یہ چھوٹی برائی ہیں تو کتنی چھوٹی برائی ہیں؟ اور اگر ان کو وزیراعظم بنانے کے لیے تحریک نے ان کا بھرپور ساتھ دیا' تو اسلام اور نفاذ شریعت کے لیے ہمیں کل کیا کچھ دیکھنے کو ملے گا؟ عام آدمی کی عزتِ نفس' اور فلاح و بہبود کی بہتری کے لیے کیا ہوگا؟ قوم کی اخلاقی' ثقافتی اور انسانی ترقی کے لیے کیا کچھ کیا جائے گا؟ معاشی ترقی کے لیے کیا ہم اندھا دھند اسی شاہراہ پر بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہیں گے جس کا خواب ہمیں مغرب نے دکھایا ہے' اور اس کے دیے ہوئے پیمانے لے کر ہم قومی پیداوار' فی کس آمدنی' موٹروے کی لمبائی اور ٹیلی فونوں کی تعداد جیسے اعداد و شمار کے سراب سے اکیسویں صدی کی طرف اپنی پیش قدمی ناپتے رہیں گے؟ جبکہ امیر' امیر تر ہوتے رہیں گے اور غریب' غریب تر' تعلیم اور صحت کا بجٹ گرتا جائے گا اور اخلاقی و دینی ترقی کا آئیٹم بجٹ میں جگہ ہی نہ پائے گا' عام آدمی اسی طرح ذلیل رہے گا اور کسان اسی طرح خستہ حال' رشوت کا بازار اسی طرح گرم رہے گا اور پولیس کی چیرہ دستیاں اسی طرح برقرار؟

مستقبل کی جھلک ماضی کے آئینہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ داستان کئی دفعہ بیان کی جا چکی ہے' اب مزید دہرانے کی محتاج نہیں۔ ان باتوں میں یقیناً وزن ہے کہ ان کے گھرانے کو دینی تشخص حاصل ہے' انہوں نے صرف ہاتھ میں تسبیح نہیں لے لی ہے بلکہ واقعی زندگی میں دینی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شعائر کا احترام ہے۔ نفاذِ شریعت سے روگردانی سہی، لیکن احکامِ الٰہی کا کھلم کھلا انکار نہیں ہے۔ دینی احیا کی کوئی فکر نہ سہی، لیکن کم سے کم ان کی طرف سے بے دینی اور اباحت کی براہ راست سرپرستی نہیں (خواہ ان کے وزیر بدنام زمانہ میڈونا کو پاکستان لانے کے لیے بے چین رہے ہوں، اور ان کے وزرا اور اہلکار دنیا بھر میں دادِ عشرت دیتے پھرتے رہے ہوں)۔ لیکن کیا یہ کافی ہے؟

ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ ان کی دین سے جتنی کچھ وابستگی ہے وہ یا تو خاندانی ورثہ ہے، یا اقتدار کی خاطر۔ یہ شبہ اس لیے قوی ہو جاتا ہے کہ ۱۷ اپریل سے انھوں نے اسلام کا نام لینا ہی تقریباً ترک کر دیا ہے۔ وہ ییلو کیب اور روزگار کے لیے قرضوں کی اسکیموں کو بآسانی سود سے پاک کر سکتے تھے، لیکن نہیں کیا۔ اب بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہہ دیا ہے کہ میں اسلامی قوانین کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اب سماں کچھ میر کے اس شعر کا سا محسوس ہوتا ہے کہ۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

اس لیے کہ کسی نے انھیں سمجھا دیا ہے کہ اسلام کا نام لینے سے خواہ مخواہ امریکہ ناراض ہوتا ہے (جس سے برسرِاقتدار آنا خطرہ میں پڑتا ہے)، جبکہ عوام کو اس کی چنداں حاجت نہیں ـــــ انھیں تو ییلو کیب، گرین چینل، فری کرنسی اور موٹر وے جیسے لالی پاپ دے کر بھی مست رکھا جا سکتا ہے۔

مستقبل دیکھنا ہو تو کیا عقلمندوں کے لیے یہ اشارہ کافی نہیں؟

اگر ہمارا یہ شبہ صحیح ہے تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ کیا اب تحریکِ اسلامی کا مقصد یہی رہ گیا ہے کہ وہ پہلے بڑی برائی کے مقابلہ میں چھوٹی برائی کو برسرِاقتدار لانے کی جدوجہد کرے، پھر جب وہ سارے وعدے وعید اٹھا کر ایک طرف رکھ دے، نفاذِ شریعت سے روگردانی کرے (بلکہ بعض لوگوں کی رائے میں شریعت کے نام پر کفرِ بواح کا ارتکاب کرے)، تعلیم اور میڈیا کو سیکولر اور خارجہ پالیسی کو امریکہ نواز عناصر کے حوالے کر دے، تو اس کے خلاف محاذ کھول لے۔ پھر جب الیکشن آئیں، تو پھر پیپلز پارٹی کے خوف سے یہی عمل دوبارہ دہرائے؟

بعض لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ ملک کو معاشی ترقی سے ہمکنار کر دیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تیسری دنیا کے نصف صدی کے تجربہ کو دیکھتے ہوئے اس حسنِ ظن کا کوئی جواز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں۔ وہ جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری ہر قسم کی ترقی خدا اور رسولؐ سے وفا پر منحصر ہے' وہ اس غلط فہمی کا شکار کیوں ہوں؟ وہ کیوں اس فریب میں آئیں کہ امریکہ ان کا مخالف اس لیے ہوگیا کہ کہیں وہ پاکستان کو کوریا اور جاپان کا ہم پلہ نہ بنا دیں؟ اگر یہ صحیح بھی ہو تو کیا اب کوریا اور جاپان بننا ہی ہمارا خواب رہ گیا ہے۔ یہ تو ہم ہندوستان کا حصہ رہتے ہوئے بھی بن سکتے تھے۔

ہم اہون البلیتین کو حکمتِ عملی کا ایک بڑا اہم اصول سمجھتے ہیں اور اس بارہ میں کسی افراط و تفریط کے قائل نہیں۔ کوئی حکمتِ عملی' بلکہ روزمرہ کی زندگی اس اصول کے بغیر نہیں چل سکتی۔ ہم یہ بالکل نہیں سمجھتے کہ اس اصول پر عمل سے ہماری انقلابیت پر کوئی ضرب پڑتی ہے۔ ان انتخابات میں بھی ہمیں' سمجھ بوجھ کے ساتھ' اس اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ لیکن ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہر حالت میں اس پر عمل کوئی دینی فریضہ ہے۔ اس پر کب' کہاں اور کتنا عمل کیا جائے' اس کا تعین دینی مصالح ہی کر سکتے ہیں۔

پھر کیا کیا جائے؟

یہ طے کرنا تحریک کے مستند اداروں کا کام ہے۔ جن کا مقصدِ زندگی رضائے الٰہی اور غلبۂ دین ہے' جو اس مقصد کے لیے تحریک سے وابستہ ہوئے ہیں' جو یقین رکھتے ہیں کہ اس وابستگی کے ذریعہ جو کچھ وہ آخرت میں حاصل کریں گے وہی ان کی اصل متاع ہے' جو یہ شعور رکھتے ہیں کہ ان کو سوچنا بھی چاہیے' اپنی رائے بھی بنانا چاہیے' اپنی رائے کو پیش بھی کرنا چاہیے' لیکن اپنے زورِ زبان و قلم سے اپنی رائے کو مقدم رکھنے پر اصرار نہ کرنا چاہیے' وہ جانتے ہیں کہ جب تحریک کے مستند ادارے کوئی پالیسی طے کر دیں تو ان کے لیے صحیح روش کیا ہے۔

لیکن ہم چند باتیں سب کے غور و فکر کے لیے ضرور سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک پیپلزپارٹی کا تعلق ہے' چھوٹی اور بڑی برائی کی بات تو اپنی جگہ صحیح ہے' لیکن شرکلی تو کوئی نہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ آج بیس سال کے بعد بھی' انتخابات پیپلزپارٹی اور اینٹی پیپلزپارٹی' پارٹی کے درمیان ہی ہو رہے ہیں' پیپلزپارٹی کا ووٹ بینک ۱۹۹۰ تک برقرار رہا ہے' اور آج بھی اگر اس کے مخالف متحد نہیں تو دلوں میں اس کے جیتنے کے خطرہ کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ تحریک ایک وقتی خطرہ کو ٹال دینے' اور اس کی خاطر ایک چھوٹی برائی کو پروان چڑھانے کے لیے نہیں بنی تھی۔ ایک دو موقعوں پر ایسا کرنا پڑے تو الگ بات ہے' لیکن اگر بیس سال سے مسلسل یہی کر رہے ہیں تو پھر سب سے اہم بات سوچنے کی یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اگر اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورتِ حال کا علاج نہ ہوا تو کیا وہ مسلسل یہی کرتی رہے گی؟ جبکہ انتخابات کو ہم نے زمامِ کار میں انقلابی تبدیلی کی خاطر اختیار کیا ہے، نہ کہ وقتی مسائل سے نپٹنے کے لیے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ جب تک پیپلزپارٹی خود ایشو (issue) بنی رہے گی وہ زندہ رہے گی۔ وہی انتخابی مہم کا مرکز بنی رہے گی، اسی پر توجہات مرکوز رہیں گی، اس کی قوت برقرار رہے گی۔ کیا یہ بات قابلِ غور نہیں کہ سارے انتخاب لڑنے والوں کا تشخص پیپلزپارٹی کے حوالے سے متعین ہو رہا ہے، کہ کون اس کے ساتھ ہے، کون اس کا مخالف ہے، اور کون اس کے جیتنے کا باعث بن رہا ہے۔ یہ صورتِ حال اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک تحریک اور اس کی دعوت و پروگرام، یا کوئی دوسری قوت، خود ایشو نہ بن جائیں۔ خود اس کا، بلکہ دوسروں کا بھی، تشخص اس کے حوالہ (reference) سے اور اس کی زبان (terms) میں نہ ہو۔ یہ مقام کسی کا دست و بازو بن کر، کسی کا ضمیمہ بن کر ہرگز بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اپنے تشخص کے ساتھ کسی سے بھی حلیفانہ تعلقات میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہود کو بھی مدینہ کی ملتِ واحدہ کا حصہ بنایا گیا، مشرکین سے بھی حلیفانہ تعلقات استوار کیے گئے۔

اس مقصد کے لیے، اپنے اللہ پر اعتماد کی بنیاد پر، اپنے اوپر اعتماد بھی ناگزیر ہے۔ اعتماد کے معنی بعید از حقیقت خواب دیکھنا نہیں، لیکن خواب دیکھے بغیر کوئی راہ معراج پر نہیں لے جاتی۔ جو دو اور دو چار کا حساب کر کے امروز و فردا کے چکر میں پھنسے رہنا ہی جانتے ہیں، وہ صرف بنیے کی دکان چلا سکتے ہیں۔ جو بڑے بڑے اور اونچے اونچے خواب دیکھنا جانتے ہیں، وہ آج پورے ہوں یا کل، یا نہ ہوں، وہی دنیا میں بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے ذہنوں میں ایک دایاں بازو بنایا ہوا ہے۔ اور خود کو اس کی قیادت کے لیے نااہل تصور کرتے ہوئے اس کی فطری قیادت ان دوسروں کے سپرد کر دی ہے، جن کا تعلق تحریک کے مقاصد سے ایک تسمہ سے اٹکا ہوا ہے، آج ہے تو کل ٹوٹا۔ بعض لوگوں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ تحریک کی منزل ۹۵۰ سال میں تو ہاتھ آ نہیں سکتی، اس لیے وعظ و تبلیغ اپنی جگہ، کارِ جہاں کی حد تک دوسروں کے پیچھے چلنا ہی مقدر ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک جو تحریک چاہتی ہے اس کے حقیقت بننے کا امکان جب صفر ہے، تو جو حقیقت کا نام لے اور اس سے دل لگائے رکھنے کی آزادی دے، اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

جن کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے، اس کے دین سے محبت ہے، جو ایمان رکھتے ہیں کہ انصار اللہ کی محبت اس محبت کا تقاضا ہے، جو یقین رکھتے ہیں کہ "قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ" ان کو یہ سارے شیطانی وساوس مسترد کر دینا چاہئیں۔ اور وسوسوں کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاج اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ان پر توجہ ختم کر دی جائے' اور ساری توجہ اپنے مقصود یعنی اللہ پر' اور اپنی منزل یعنی غلبۂ دین کی طرف مرکوز کر دی جائے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (الانعام ۶:۷۹)

دراں حالات تحریک نے اپنی مستقل حکمتِ عملی کی طرف جو قدم اٹھایا ہے' اسی کو آگے بڑھانا چاہیے۔ انتخابات میں حصہ لے تو اسلامک فرنٹ لے۔ اسلامک فرنٹ اپنے قدم آگے بڑھانے کے لیے جہاں جس کو اپنا حلیف بنا سکے' اس کو اپنا حلیف بنائے۔ محاذ آرائی کم سے کم ہو' اپنے مثبت پیغام کو پہنچانے کی فکر زیادہ سے زیادہ ہو۔

اس حکمتِ عملی کو نتیجہ خیز ہونے کے لیے بہرحال وقت کی ضرورت تھی۔ موجودہ حالات میں جب دو بڑی متحارب قوتیں میدان میں نبرد آزما ہیں' ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ہمارے رائج طریقِ انتخاب کے تحت یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہو۔ لیکن اپنی مستقل حکمتِ عملی کے مطابق اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اس پہلے مرحلہ میں صفر سیٹ بھی ان آٹھ سیٹوں سے بہتر ہوں گی جو دوسروں کا تابع ہونے کی صورت میں ہمیشہ کے لیے ہمارا مقدر بن گئی ہیں۔ اگرچہ ان سیٹوں کو برقرار رکھنے کی اور ان میں اضافہ کرنے کی ہر ممکن کوشش ہماری ذمہ داری ہے۔

وابستگانِ تحریک سے ہم یہی گزارش کریں گے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے تشخص اور اپنی دعوت و پروگرام کی بنیاد پر' اپنا سفر جاری رکھیں۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (محمد ۴۷:۷)

© rasailojaraid.com